ہندی مسلمانوں کے فلسفیانہ افکار

ڈاکٹر کے سچیدا نند مورتی

ترجمہ:- پروفیسر صفی الدین صاحب صدیقی

(صدر شعبۂ فلسفہ و نفسیات گورنمنٹ کالج آرٹس اینڈ سائنس اورنگ آباد)

(ڈاکٹر کے۔ سچیدا نند مورتی آندھرا یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ سے متعلق ہیں، موصوف کا یہ مقالہ بزبانِ انگریزی "دی انڈو ایشین کلچر (نئی دہلی) کے چوتھے شمارے اپریل ۱۹۶۲ء میں شائع ہو چکا ہے، محترم ڈاکٹر سید وحید الدین صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ کی ایما پر میں نے اس مقالے کا سلیس اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

اس مقالے کے مطالعہ سے قاری پر یہ ضرور واضح ہوگا کہ ایک ایسے عالم نے ہندی مسلمانوں کے فکری سرمائے کا جائزہ لیا ہے جو خود تو امتِ مسلمہ کا فرد نہیں ہے لیکن جس نے نہایت خلوص کے ساتھ مسلمان علمائے عظام کے افکار کو اپنے نقطۂ نظر سے سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ پروفیسر صاحب موصوف نے اکثر جگہوں پر انھیں خیالات سے اتفاق کیا ہے جنہیں اکثر مستشرق اپنی تصنیفوں میں دہرا چکے ہیں اور جن سے کہ مسلمان محقق بالکلیہ طور پر متفق بھی نہیں ہیں، ہمارے آج کل کے مسلمان اصحابِ علم کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کے فکری سرمائے پر غور کرنے اور اس کا تقابلی مطالعہ کرنے میں جھجک محسوس کرتے ہیں، تحقیقی مقالے لکھنے اور چھپوانے کی بات تو بہت دور کی ہے، اس لحاظ سے ہم پروفیسر مورتی کی کوشش کو قابلِ قدر محسوس کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہمارے اصحابِ علم اس جہت میں مزید کچھ لکھنے کی زحمت گوارا کریں گے۔

(صفی الدین صدیقی)

ہم کوئی سا بھی نقطۂ نظر اختیار کریں لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ مسلمان ہندوستان کی کُل آبادی کا ایک اہم حصہ ہیں، ۱۹۵۶ء کی مردم شماری کی رو سے ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد چالیس ملین سے کچھ اوپر ہی پہنچتی ہے، اگر یہ نکتہ پیش نظر رہے کہ مصر ترکی اور ایران میں سے ہر ایک ملک کی آبادی بیس ملین کے لگ بھگ ہے۔ صرف پاکستان اور انڈونیشیا میں سے ہر ایک مملکت کی آبادی ستر ملین سے کچھ زیادہ ہی ہے تو پھر یہ واضح ہو جائے گا کہ موجودہ اسلامی دنیا میں ہندوستانی مسلمانوں کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے، قطع نظر اسکے ہندوستانی مسلمان ایک ہزار سال سے چلی آنے والی عظیم روایات کے حامل ہیں، ان کے درمیان بڑی بڑی شخصیتوں نے جنم لیا ہے، سیاست کی جدید صورتوں کی انھوں نے تشکیل کی ہے۔ انھوں نے عظیم ادب پیدا کیا ہے، زندگی کے نئے طور طریقوں کی بنیاد ڈالی ہے اور سب میں بڑھ کر فن کے زندہ جاوید نمونوں کو جنم دیا ہے، دنیا کے نقشہ میں کہیں پر بھی ہم کو ایسی مملکت دکھائی نہیں دیتی کہ جہاں پر مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد ایک غیر مذہبی جمہوری حکومت کے زیرِ سایہ مختلف النوع مذاہب کے ماننے والے اتنے کثیر عوام کے دوش بدوش زندگی گزار رہی ہو، تواریخی روایات، تعداد اور پھر ہندوستانی مسلمانوں کا موجودہ موقف یہ چند ایسے عناصر ہیں جو ہم کو ان کے فکری سرمائے پر توجہ دینے پر اکساتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم انیسویں اور بیسویں صدی کے اندر داخل ہوں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قرونِ ماضیہ کی ان چند تحریکوں پر نظر ڈالیں جو مسلمانوں کے جدید فکری ڈھانچے کے لئے پس منظر کا کام دیتی ہیں، عہدِ وسطیٰ کے اسلامی ہندوستان میں ہم کو خالص فلسفیانہ افکار یا مذہبی اجتہاد کے کوئی نشانات نہیں ملتے، اگر ہم ان افکار کا مقابلہ ابن سینا، الغزالی اور ابن رشد کے عظیم کارناموں سے کریں تو انکی اہمیت اور بھی گھٹ کر رہ جاتی ہے، البتہ اکبر اور داراشکوہ یہ دو استثنائی صورتیں ہیں کیوں کہ ان دونوں نے جدت کی طرف عملی قدم بڑھایا تھا، اکبر نے جیسا کہ ہم جانتے ہیں ایک نئے دین کی بنیاد رکھنی چاہی تھی جو کہ وحدانیت پر مبنی تھا اور جس کے اندر متصوفانہ زہد بھی شامل تھا، اکبر کے مذہب میں سورج کی پرستش کو اس لئے داخل کر لیا گیا تھا کہ وہ 'نورِ عقل' کا اعلامیہ ہے، علاوہ ازیں اس نئے مذہب کا مقصد ایک خاص اخلاقی ضابطہ کو بھی روشناس کرنا تھا (دبستان مذاہب، محسن فانی) (اس سلسلے کا ایک دوسرا نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ

اکبر نے اسلام کے اندر شرک کو داخل کیا تھا) اکبر کے پر پوتے داراشکوہ نے کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں وہ اس امر پر زور دیتا ہے کہ روحِ انسانی خدا کی ذات میں جذب ہونا چاہتی ہے (توحید) داراشکوہ ایک ایسے تصورِ خدا کا قائل ہے کہ جو قادرِ مطلق ہے اور جس کے اندر کائنات کی ہر چیز شامل ہے جس طرح کہ ایک بحرِ بیکراں عبارت ہوتا ہے، امواج، قطرات اور حبابوں کے مجموعہ سے (رسالۂ حق نما) داراشکوہ نے اپنشدوں کا بنظرِ عمیق مطالعہ کیا تھا، وہ انھیں قدیم ترین آسمانی صحائف اور وحدانیت کے خزینے متصور کرتا ہے، بلاشبہ یہ ایسا تصور ہے جو کہ قرآن کی تعلیمات سے بھی ہم آہنگ ہے[1]۔ بدقسمتی سے اکبر کی تمام عقلی کوششیں، مذاہب کو ایک مرکز پر لانے کی اس کی تمنا، اس کے علاوہ داراشکوہ کا وُحدت الوجود کا بنیادی نظریہ (بعض صوفیا نے کہا، جیسے کہ ابن عربی اس نظریہ کے حامل ہیں) اور داراشکوہ کا یہ دعویٰ کہ اپنشدوں اور قرآن نے ایک ہی حقیقت کی طرف نشان دہی کی ہے[2] ان تمام عقائد نے بالآخر اکثر مسلمانوں کو مخالفت پر آمادہ کر دیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہندوؤں نے بھی ان خیالات کی پشت پناہی نہیں کی، شیخ احمد سرہندی (۱۵۶۴-۱۶۲۴) جن کا مولد پنجاب ہے، جنھوں نے اکبر اور جہانگیر کا زمانہ دیکھا ہے نظریۂ وحدت الوجود کی شدید مخالفت پر آمادہ ہوئے، شیخ سرہندی خود ایک پایہ کے صوفی تھے، انھوں نے خدا کی ازلی ماورائیت کے تصور پر زور دیا، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی عہدِ شاہجہانی کے مشہور عالم گزرے ہیں، اس کے علاوہ فرنگی محل اور خیرآباد نام کے دو فکری دبستانوں کا ذکر کیا جانا بھی ضروری ہے، دبستانِ فرنگی محل کے مشہور علماء میں ملا قطب الدین شہید (وفات ۱۶۹۱) ملا نظام الدین (وفات ۱۷۴۸) اور مولانا عبدالعلی بحرالعلوم (وفات ۱۸۱۹) کا شمار ہوتا ہے، دبستانِ خیرآباد کے علمائے کبار میں فضلِ امام خیرآبادی (وفات ۱۸۲۷) فضلِ حق خیرآبادی (وفات ۱۸۶۱) کے نام گنوائے جا سکتے ہیں، ان کے علاوہ اودھ کے قاضی مبارک (وفات ۱۷۴۸) ملا محمود جون پوری (وفات ۱۶۵۱) حمید اللہ سندیلوی (وفات ۱۷۴۷) ملا محب اللہ بہاری (وفات ۱۷۰۷) غلام یحییٰ بہاری (وفات ۱۷۱۵) کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے، حکمائے اسلام (مصنفہ عبدالسلام ندوی)

---

[1] جی بی حسرت، داراشکوہ: حیات اور کارنامے وشو بھارتی ۱۹۵۳ء)

[2] قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ رسول اور ہادی ہر امت اور ہر قوم میں بھیجے گئے، قرآن ۱۷، ۱۵، ۲۵، ۴۴، ۵۷، ۲۵،

دولتِ مغلیہ کے عہدِ زوال میں شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۰۳-۱۷۶۲) نے مذہب اسلام کو غیر اسلامی عناصر سے پاک کرنے کی مہم چلائی۔ آپ نے عام مذہبی بیزاری اور تصوف کے اندر ناجائز اور ناپسندیدہ اشغال کو روا رکھنے کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا، شاہ صاحب کا سب میں بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے تصوف اور عقائد سنت والجماعت کی تطبیق کی، شاہ ولی اللہ اسلامی شان و شوکت کا احیا چاہتے تھے، شاہ صاحب کی وجہ سے مذہبی جماعتوں اور فرقوں کے درمیان اختلافات و مناقشات کا بازار ٹھنڈا پڑ گیا، اس کا باعث یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اورنگ زیب کے بعد سیاسی سطح پر شورشیں برپا تھیں۔

شاہ ولی اللہ کے فرزند شاہ عبدالعزیز اور ان کے پوتے شاہ اسمٰعیل (۱۷۸۱-۱۸۳۱) نے ان کے افکار کو عمرانی و سیاسی تحریک کی شکل دیدی، اس تحریک کے ہدف اگر ایک طرف بے دینی، اندرونی خلفشار اور امتِ مسلمہ کے زوال کے اجزا تھے تو دوسری طرف پنجاب میں سکھوں، بنگال میں انگریزوں اور دکن میں مراہٹوں کی جارحانہ کارروائیاں بھی تھیں۔ پنجاب اور شمال مغربی ہند میں سید احمد بریلوی نے اور بنگال میں فرائضیوں نے اس تحریک کو ایک عسکری تنظیم کی صورت دیدی۔

مصر میں جمال الدین افغانی (۱۸۳۹-۱۸۹۷) نے جہد اور حرکت کے ایک ایسے نظریہ کا پرچار شروع کیا کہ جس کی بنیاد انھوں نے قرآن حکیم کی اس آیت پر (بے شک اللہ تعالیٰ افراد کی حالت اُس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے نفوس میں تبدیلی نہ لائیں۔[1]) رکھی تھی، وہ امتِ مسلمہ کے اندر بیداری کے خواہاں تھے، وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان تقدیر پر تکیہ نہ کریں اور دُنیوی جاہ و حشمت کے پیچھے نہ دوڑیں تاآنکہ ایک ایسی اسلامی سوسائٹی کا قیام ممکن ہو جائے جس کی انھیں خواہش تھی،

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ سے لے کر بعد کے ادوار کی اسلامی تحریکوں میں عقلی رجحان کے کوئی نشانات نہیں ملتے، جمال الدین افغانی نے جس وقت حرکت اور جہد کا نظریہ پیش کیا تو یہی مسلمانوں کے لئے ایک مثالی نظریہ بن گیا۔ مسٹر ایف رحمان کے خیال میں اسی کے نتیجے کے طور پر اسلام جدید میں فکری و ذہنی زوال پذیری کے نشانات نظر آتے ہیں۔[2]

---

[1] قرآن ۱۳-۱۱ [2] جرنل آف ورلڈ ہسٹری - پیرس

برصغیر ہند میں سب سے پہلے ہندوؤں نے مغربی اثرات کی اہلیت کو تسلیم کیا اور وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے وہ ایک نشاۃ ثانیہ جدیدہ کے موجب بنے، اس کے برخلاف ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے کوئی مثبت ردعمل ظاہر ہونے میں کافی دیر لگی کیوں کہ برطانیہ کو مسلمان اپنا حریف سمجھتے تھے۔ برطانیہ ہی کی وجہ سے ہندوستان کی شاندار اسلامی حکومت کا خاتمہ ہوگیا تھا، یہی باعث تھا کہ برطانوی سامراج نے ہندوؤں کی بہ نسبت مسلمانوں کے ساتھ نہایت ہی سفاکانہ رویہ اختیار کیا اور انہیں ہر طرح کی مراعات سے محروم کردیا۔

سرسید احمد خان (۱۸۱۷-۱۸۹۸) وہ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جنھوں نے اپنی قوم کو ناامیدی اور شکست خوردگی کے خواب سے جھنجوڑ کر جگایا، وہ بڑے کشادہ دل اور عقلیت پسند انسان واقع ہوئے تھے، فرقہ پرستی کی اسپرٹ ان کے اندر نہیں تھی، ان کا یہ ایقان تھا کہ تمام ہندوستانی خواہ وہ ہندو اور مسلمان ہوں یا عیسائی ایک ہی ملک کے باشندے ہیں اور ایک قوم کے افراد کہلاتے ہیں، سرسید یہ چاہتے تھے کہ مغربی فکر کے بہترین عناصر کے انجذاب سے ایک نئی ہند اسلامی تہذیب کی بنیاد ڈالی جائے۔ انھوں نے ہندی مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے روشناس کیا، علی گڈھ کالج کی بنیاد رکھی جو بعد کو چل کر یونیورسٹی میں تبدیل ہوگیا، ان کی رو سے صحیفۂ فطرت (نیچر) اور خدا کے کلام میں کوئی تناقض نہیں پایا جاتا۔ سرسید نے اُن اعمال اور عقائد کی شدت کے ساتھ مذمت کی جو غیر عقلی اور غیر فطری ہوں، اور جن کی اساس قرآنی تعلیمات پر نہ رکھی گئی ہو، سائنسی اور حکمتی امور کی حد تک قرآن میں کوئی صراحت نہیں ملتی، البتہ قرآن میں اخلاقی امور پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ (آخری مضامین) لیکن انہی خیالات کی اشاعت کی وجہ سے سرسید کے خلاف اعتراضات کا ایک طوفان برپا ہوگیا۔ مغربی تعلیم، جدید سائنسی طرز فکر اور قرآنی تعلیمات کے درمیان تطبیق کے اس عمل کو ان کی قوم کے افراد نے سخت ناپسند کیا۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ قرآنی تعلیمات کو اس طرح کی آمیزش سے پاک رکھا جائے۔[1] اپنی قوم کے جسم میں آزاد خیالی اور عقلیت پسندی کی روح پھونکنے میں سرسید ناکام رہے۔

---

[1] جے، ایم، ایس بلجان: سرسید احمد خاں کے اصلاحات اور مذہبی تصورات، لندن ۱۹۴۹ء

سید چراغ علی اور نواب محسن الملک نے سرسید کی عقلیت پسندی کی حمایت کی لیکن یہ حضرات آگے چل کر سرسید کے خیالات سے پوری طرح متفق نہیں رہے، اُردو شاعر خواجہ الطاف حسین حالی، عالم دین شبلی نعمانی اور نذیر احمد (جنھوں نے قرآن کا سلیس اُردو میں ترجمہ کیا تھا) سرسید کے حامیوں میں تھے۔
آزادیٔ افکار کی صحیح اسپرٹ ہم کو سید امیر علی (۱۸۴۹ - ۱۹۲۸) مصنف دی اسپرٹ آف اسلام، عبید اللہ سندھی (۱۸۷۲ - ۱۹۴۴) اور ابو الکلام آزاد (۱۸۸۸ - ۱۹۵۸) کے ہاں ملتی ہے۔ اگر ایک طرف سرسید اور امیر علی نے یورپ سے اثر قبول کیا تھا تو دوسری طرف عبید اللہ سندھی اور ابوالکلام آزاد اسلام کے شاندار ماضی سے متاثر ہوئے تھے۔

امیر علی اس بات پر زور دیتے تھے کہ قرآن کو علماء کی تعبیر و تفسیر کا مرہونِ منت ہوئے بغیر پڑھنا چاہیے اور پھر اس کی تشریح اپنے ذاتی تنقیدی شعور کی بنا پر کی جانی چاہیے۔ امیر علی نے تعددِ ازدواج اور پردے کی شدت کے ساتھ مذمت کی، سوائے اس ایک امر کے کہ عیسائی حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں، اسلام اور عیسائیت کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔

جس طرح برہمو سماج نے آریہ سماج جیسی تحریک کو جنم دیا تھا بالکل اسی طرح سرسید کی آزادخیالی اور علی گڑھ کالج نے اُن طاقتوں کو پیدا کیا جو روایت پرستی کی حامل تھیں، اس کا ردِعمل دارالعلوم دیوبند (یو، پی) کی شکل میں نمودار ہوا جس کا مقصد پرانی روایتی تعلیمات کا احیا تھا۔

شبلی نعمانی (۱۸۵۷ - ۱۹۱۴) آغاز میں سرسید کے پیرو تھے لیکن بعد کو انھوں نے لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کی بنیاد ڈالی جو قدامت پسندی اور جدیدیت جیسے انتہا پسندانہ نقاطِ نظر کی درمیانی شکل کا نام تھا، شبلی نعمانی کہتے ہیں کہ قدامت پسندی پر عقلیت کے ذریعہ روک لگائی جا سکتی ہے۔ (دیکھیے شبلی علم الکلام) شبلی کے مذہبی عقائد نے بڑی حد تک کٹر پرستی اور انتہا پسندانہ جدیدیت کے درمیان توازن قائم رکھنے کا کام انجام دیا۔ شبلی کی تحریک کو سید سلیمان ندوی اور عبدالسلام ندوی نے آگے بڑھایا۔

مرزا غلام احمد (۱۸۳۹ - ۱۹۰۸) نے جن کا مولد پنجاب ہے اپنے مہدیٔ موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔

تاکہ وہ اسلام کی تطہیر کا کام انجام دے سکیں، یہ نظریہ کہ جب بھی دین و مذہب افتراق و بحران کا شکار ہوتا ہے تو مِلّت مخالفِ دین قوتوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے ایک مہدی کا ظہور ہوتا ہے، بہت پرانا یہودی نظریہ ہے جو کسی نہ کسی طرح ان حدیثوں میں جگہ پا گیا جو پیغمبرِ اسلامؐ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ لیکن اسلام کے تاریخی ادوار میں جن اصحاب نے بھی اس قسم کا دعویٰ کیا وہ سیاسی حیثیت سے طاقتور نہیں تھے، یہی باعث ہے کہ اس طرح کے دعووں اور فتنوں کو نہایت سختی کے ساتھ دبا دیا گیا۔ غلام احمد نے مسلمانوں کی ایک خاصی تعداد کو اس بات پر ہموار کر لیا کہ وہ مہدی ہیں، اس طرح فرقۂ احمدیہ کی بنیاد پڑی اور قادیانی تحریک (اس تحریک کا نام پنجاب کے ایک قریہ قادیان کی وجہ سے پڑا ہے) دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل گئی، پاکستان کے اندر ۱۹۵۳ء میں قادیانیوں کے خلاف منافرت کا ایک زبردست طوفان اٹھ کھڑا ہوا جس کے نتیجے کے طور پر کچھ سرپھرے مسلمانوں نے نہ صرف لوٹ مار کا بازار گرم کیا بلکہ سیکڑوں احمدیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

سر محمد اقبال (۱۸۷۳ - ۱۹۳۸) پنجاب میں پیدا ہوئے، جرمنی اور کیمبرج میں انھوں نے فلسفہ اور قانون کی تحصیل کی، کچھ عرصہ کے لئے وہ لاہور کالج میں معلمی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے، بعد ازاں اقبال نے معلمی ترک کر دی اور ایک آزاد پیشہ وکیل کی حیثیت میں کام کرنے لگے، نطشے، برگساں جلال الدین رومی (ترکی کے زبردست صوفی مفکر) اور جمال الدین افغانی کی تعلیمات کا ان پر بہت گہرا اثر پڑا۔ اقبال انفعالیت اور جمود کے سخت مخالف تھے، وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے زوال کا اصل باعث بے عملی کا وہ فلسفہ ہے جس کو چند برخود غلط صوفیوں نے عام کر رکھا ہے، اقبال کی رو سے عشق ہی خیر برتر ہے، آدمی کے اندر عقل کو ارفع ترین صلاحیت تسلیم نہیں کیا جانا چاہئے، زندگی عمل سے عبارت ہے، شر سے نبرد آزما ہونے ہی سے زندگی کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے، اقبال ابتدا میں قوم پرست تھے لیکن بعد کو انھوں نے اس امر پر زور دیا کہ مسلمان کا تعلق کسی ایک قوم سے نہیں ہے بلکہ تمام دنیا کے مسلمان خواہ وہ کہیں کے رہنے والے ہوں نسب اور نسل کے امتیاز کے بغیر امتِ مسلمہ سے منسلک ہیں۔ ان کا آبائی وطن اسلام کے علاوہ کچھ نہیں، جو کوئی فرد خدا، اس کے احکام اور خیر کے معیارات کو تسلیم کرتا ہے،

وہ مسلمان ہے، امتِ مسلمہ کے اندر کسی بھی فرد کو برتری اس کے مرتبے، نسب اور امارت کی وجہ سے حاصل نہیں ہے بلکہ وہ اپنے اعمالِ حسنہ کی وجہ سے برتر و بزرگ گردانا جاتا ہے، صداقت کا نزول خواہ کہیں پر بھی ہو وہ اسلام ہے، وہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تھی کہ جس نے اس صداقت کو مکمل ترین حالت میں اور نبی آخرالزماں کی حیثیت میں قبول کیا، اقبال اپنے آخری زمانے میں اشتراکی خیالات سے بھی متاثر ہوئے تھے۔

اسرارِ خودی، رموزِ بیخودی اور اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید اقبال کے نہایت اہم فلسفیانہ کارنامے ہیں، اول الذکر کتابیں ان کی فلسفیانہ شاعری کے نمونے ہیں، اقبال کی رو سے وجود کی تمام صورتیں خودی کے عمل کا نتیجہ ہیں، جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ خودی کے اسرار میں سے ہے۔ خودی کی ذات میں سیکڑوں جہان مستور ہیں، جب خودی اپنے خواب سے بیدار ہو کر شعور کی سطح پر آتی ہے اور اپنا اثبات کرتی ہے تو افکار کی دنیا جاگ اٹھتی ہے، غیر خودی کے چہرے سے نقاب اٹھ جاتی ہے، عمل کی خاطر خودی طرح طرح کے روپ بھی دھارتی ہے، وہ کبھی موضوع ہے تو کبھی مفروض کبھی ذریعہ ہے تو کبھی اسباب و علل، زمان خودی کا چوگان ہے، چوں کہ زمان ازلی و ابدی ہے، جس کا آغاز ہے نہ انجام اس لئے خودی سے جو عمل بھی سرزد ہوتا ہے اس کی کبھی نہ ختم ہونے والی اہمیت ہوتی ہے، تاریخ کے آئینہ ہی میں خودی کو اپنی ذات کی معرفت ہوتی ہے، زندگی تسلسلِ شعور کی موج کا نام ہے، زمان کنہہ اور اس کی دائمیت کو پہچاننا ہی دراصل جاوداں زندگی کے راز سے واقف ہونا ہے۔ آرزو اور مقصد سے حیات کا تحفظ ہوتا ہے، آرزو ہی اصلِ حیات ہے اور اسی سے مقصدِ حیات کا تعین ہوتا ہے، آرزو اور مقصد سے معرا آدمی مردہ کہلاتا ہے، آرزو نہ صرف حیات کی تعمیر کرتی ہے بلکہ حیات کو مالا مال بھی کرتی ہے، تمام انسانی مساعی کا مدار آرزو کی تکمیل پر ہے۔ خودی اپنے مفہوم کی تکمیل تک اسی وقت پہنچ سکتی ہے جبکہ وہ ملت سے رابطہ پیدا کرتی ہے، ایک ایسی ملت کہ جس کی اساس محکم اصولوں پر رکھی گئی ہے، عشق ہی کے ذریعہ خودی کا مکمل نشو و نما ممکن ہے، عشق اعمالِ صحیحہ اور علم کی اساس ہے، عشق سے خودی زندہ و تابندہ ہے، خودی کا وجود عشق ہی سے متمیز ہے اور عشق ہی کے ذریعہ اس کے امکانات کا نشو و نما ممکن ہے،

عشق سے اقبال یہ مراد لیتے ہیں کہ خدا سے والہانہ ربط پیدا کیا جائے جو جملہ مقاصد اور اعمال کا مبدأ ہے، عشقِ حق آخر میں سرتاسر حق بن جاتا ہے۔

اقبال یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان یورپی افکار کا مطالعہ کریں اور پھر ان کی روشنی میں الہیات اسلامی کی تشکیل جدید کریں، اقبال تقدیر کے نام نہاد تصور کو سختی سے رد کرتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ چند موقعہ پرستوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے اس نظریہ کی حمایت کی ہے۔جنت و جہنم اقبال کے نزدیک مقامات نہیں بلکہ احوال ہیں، بہشت مرکز گریز قوت پر فتح حاصل کرنے کی مسرت کا نام ہے۔اس کے برخلاف جہنم ایک فرد کی اپنی ناکامی کے دردناک احساس کا نام، دوزخ و بہشت آئندہ تخلیقی امکانات کی طرف ہماری رہبری کرتے ہیں، سقوطِ آدم اصل میں ایک کنایہ ہے۔جس کے اندر یہ مضمر ہے کہ کس طرح جبلی شہوات سے اوپر اُٹھنے کے بعد آدم کو ایک آزاد انا کے حصول کا شعور ہوتا ہے، کس طرح اس کے اندر شک و انکار کی صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں اور بالآخر کس طرح ایک متناہی انا (FINITE EGO) کے اندر تمیز کی صلاحیت کا بروز ہوتا ہے، انسانی انا یا تخلیقی آزادی کا حامل ہے، چنانچہ اقبال کے یہ خیالات ایسے ہیں کہ جن کو بعض کٹر مسلمان خطرناک حد تک مضرت رساں خیال کرسکتے ہیں۔

ہندوستانی قومیت کا ہندوانہ نقطۂ نظر اور پھر ہندی مسلمانوں کے اندر پایا جانے والا جذباتی خلاء (پان اسلامزم اور خلافت کے تصورات اس صدی کی تیسری دہائی میں بے معنی ہو چکے تھے جب کہ دیگر اسلامی ممالک نے اپنی علیحدہ قومیت کی بنیاد رکھنی چاہی) یہ وہ اسباب تھے کہ جس کے باعث ہندوستانی مسلمان قومیت کے تصور سے کٹ کر کسی اور سمت میں بہنے لگے، اقبال کے یہ خیالات کہ مسلم وحدت کا تصور دراصل دینِ فطرت سے ماخوذ ہے۔امتِ مسلمہ یک جان دو قالب ہے اور یہ کہ مسلمان قیدِ مقام سے آزاد ہے، انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے بارے میں ایک الگ قسم کی آگہی بخشی، اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ہندوستانی مسلمان دوسرے مذاہب کے پیرؤوں کے مقابلے میں خود کو خیال و عمل کی حد تک جدا محسوس کرنے لگے، سنہ ۱۹۳۰ء کے اواخر میں اقبال ایک علیحدہ مسلم ریاست کی باتیں کرنے لگے تھے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تصور مختلف وجوہات کی بناء پر، جس میں اکثریتی طبقے کی غلطیاں بھی شامل ہیں،

جیسے کہ بعض ہندو رہنماؤں کی حد سے زیادہ مذہب پرستی، اس کے علاوہ مسلمانوں میں جدید طرزِ فکر سے متاثر ہونے والے ایک باشعور طبقۂ متوسط کی عدم موجودگی، مسلم عوام پر جاگیردارانہ تہذیب کی گرفت، بہرحال ان سب باتوں نے پاکستان کے قیام کے لئے زمین ہموار کردی،

اقبال ایک عظیم شاعر اور مفکر ہیں، دورِ جدید کے وہ سب میں بڑے اسلامی مفکر ہیں، پاکستان کے فلسفیوں پر ان کی تعلیمات کا بہت گہرا اثر نظر آتا ہے، یہ بات نہایت سودمند ہوگی اگر ہم اقبال کے نظریۂ خودی کا ویدانت کے نظریۂ آتم واد سے مقابلہ کریں اور اس کی روشنی میں اقبال کی تصوریت کا نئے سرے سے تنقیدی جائزہ لیں۔

جمال الدین افغانی اور اقبال دونوں ہی حرکت وعمل کے دلدادہ تھے، چناں چہ ان کی تعلیمات کی یک رخی تفہیم کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ حرکت وعمل کے ایسے فلسفہ کو لازماً سراہا گیا، جس پر نہ تو عقلی طور پر سوچ سمجھے مقصد اور نہ کسی قسم کے مذہبی ایقان کی چھاپ تھی۔ پنجاب اور صوبہ سرحد میں خاکساروں اور حیدرآباد دکن میں رضاکاروں نے انھیں رجحانات کی نمائندگی کی تھی، موجودہ اسلامی دنیا میں اسی مجنونانہ نقطۂ نظر کے طفیل قتل وغارت گری اور غیر مسلموں کے مال ومتاع کو لوٹنے کی جو وارداتیں پیش آتی رہتی ہیں وہ بڑی حد تک ان فلسفوں کی یک رخی تعلیمات کی عکاسی کرتی ہیں، ظاہر ہے کہ ایک ایسا فلسفہ جس کی بنیاد برگساں نٹشے اور روس کی اشتمالی سرگرمیوں پر رکھی گئی ہو اور پھر عامۃ الناس کے جذبات کو اسلام کے شان دار ماضی کی یاد دلا کر برانگیختہ کیا ہو، ان افراد کو یقیناً متاثر کرے گا جو جاہ ومنصب کے حریص اور طاقت کے بھوکے ہوتے ہیں۔

ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ - ۱۹۵۸) عظیم آزاد خیال عالم دین تھے، ان کے اسلامیات کے مطالعہ پر جدید نقطۂ نظر اور عالمانہ تبحر کی چھاپ نظر آتی ہے، اپنی تصنیفوں اور تذکرہ، ترجمان القرآن، اور غبارِ خاطر میں وہ ایک عظیم الشان خطیبانہ انداز میں واضح کرتے ہیں کہ اسلامی فکر کو ایک نئی رہ گزر کی ضرورت ہے۔ آزاد نے غلط تعبیروں اور تاویلوں کے غیر ضروری انبار کو رد کرکے قرآنی تعلیمات کی سچی روح کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، افسوس تو یہ ہے کہ ان کی عالمانہ اور محققانہ تصنیفیں دنیا کی کسی بڑی زبان میں منتقل نہ ہو سکیں،

البتہ ان کی تفاسیر کے کچھ حصے ڈاکٹر سید عبداللطیف اور اشفاق حسین کی کوشش سے انگریزی تراجم میں دستیاب ہو جاتے ہیں، ان کے علاوہ آزاد کی کچھ یادداشتیں بھی انگریزی میں مل جاتی ہیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ۱۹۳۲ء کے لگ بھگ حیدر آباد اور اس کے بعد پٹھان کوٹ سے اپنا رسالہ ترجمان القرآن نکالنا شروع کیا (مودودی بعد کو پاکستان ہجرت کر گئے حالانکہ وہ تحریک پاکستان کے حامی نہیں تھے) بعض مصنفوں کی رائے میں وہ اسلام جدید کے سب میں زیادہ منظم مفکر ہیں[1] وہ اسلام کو ایک ایجابی نظام کی صورت بخشنا چاہتے ہیں، اور اس امر پر زور دیتے ہیں کہ اسلام اپنے اندر تمام انسانی مسائل کا حل رکھتا ہے، بعض مصنفوں کی رو سے مودودی کا نظام فکر ذہنی اعتبار سے منضبط ہے اور کافی حد تک وسیع و کشادہ[2] وہ یہ چاہتے ہیں کہ مغرب کی سمت سے آنے والے رجحانات کو یک لخت روک دیں، انھوں نے مسلمانوں کو مغرب کی غلامی سے آزاد کرانے کا بیڑا اٹھایا ہے؛ انکا منشا یہ ہے کہ ایک خالص اسلامی سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا جائے، مودودی کی رائے میں گو اسلامی قانون تیرہ سو برس پیشتر پیش کیا گیا تھا لیکن اس میں انجماد کی کیفیت کبھی پیدا نہیں ہوئی کیوں کہ یہ آئین اسلامی سوسائٹی کا جزو لاینفک ہے ۔ قرون ماضیہ میں ایسی مملکتیں معرض وجود میں آچکی ہیں کہ جن کے نظم و نسق کا انحصار اسی قانون اور آئین پر رہا ہے، لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی دستور نے ہمیشہ بدلتے ہوئے انسانی حالات کا ساتھ دیا ہے اور اسی کی روشنی میں اس دستور کا ارتقا ہوا ہے، اس آئین میں بڑی بڑی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں ۔ اجتہاد، اجماع اور قیاسی دلائل کی بنیاد پر اب بھی اسلامی فقہ کا نشو و نما ممکن ہے اور اس طرح تمام جدید مسائل کا حل ڈھونڈھا جا سکتا ہے، اسلامی دستور اور فقہ کے سرچشموں میں قرآن، سنت، خلفائے راشدین کے دور کی روایات اور فقہا کی آراء کا شمار کیا جا سکتا ہے ۔ مودودی اس بات کی تمنا کرتے ہیں کہ اسلامی ممالک میں بتدریج ایسا انقلاب لایا جائے کہ جس کے باعث مغربی تصورات کی بنیاد پر کھڑا ہوا یہ ڈھانچہ ڈھے پڑے اور اس کی جگہ پر ایسی عمارت کھڑی کی جائے جو اسلامی آئین و دستور پر مبنی ہو اور جس کا سرچشمہ اوپر کے گنائے ہوئے چار

---

[1] ڈبلیو سی اسمتھ : اسلام ان ماڈرن ہسٹری صفحات ۲۳۳ - ۲۳۶

[2] ایضاً -

ماخذ ہوں[1]۔ مودودی نے ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی، اس تنظیم کا لائحہ عمل انہیں خیالات کی تبلیغ اور انھیں مقاصد کا حصول ہے۔

اسلام کے لئے مودودی کی حیثیت بالکل وہی ہے جو کہ ویدک مذہب کے لئے میمانکاؤں کی ہو سکتی ہے، مودودی کے آئین کے چار ماخذوں کا مقابلہ شتری، سمرتی، سداچار اور براہمن دانشوروں کی آرا سے کیا جا سکتا ہے، اس طرح اسلامی فقہ کے نشو و نما (تاویل، قیاس، اجتہاد اور استحسان) کا مقابلہ میمانسا کے دلائل سے بڑا دلچسپ اور معلومات آفریں ثابت ہوگا۔

پاکستان کے قیام سے قبل ام، ام، شریف، علی گڑھ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے، آج کل وہ لاہور کے ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے ڈائرکٹر ہیں، پاکستان کے فلسفیانہ حلقوں میں پروفیسر شریف کا مقام کافی اونچا ہے شروع میں وہ تجربی تصوریت (EMPERICAL IDEALISAM) کے حامل تھے لیکن کیمبرج پہنچ کر انھوں نے رسل اور مور کے خیالات سے اثر قبول کیا، آگے چل کر پروفیسر شریف نے جس نظریئے کی تشکیل کی اسے جدلی موناد یت (DILECTICAL MONADISM) کا نام دیا جا سکتا ہے۔ فلسفہ نام ہے حکمت اور تجربے کے منضبط رجحان کا۔ حقیقت اور ذات معلوم دونوں کا علم ممکن ہے۔ زمان و مکان سے ماورا حقیقیوں کا علم قیاس کے ذریعہ ممکن ہے، ہر فرد بذات خود ایک 'موناد' ہے، چوں کہ مونادات ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور اپنے اعمال میں ایک دوسرے سے مشابہت بھی رکھتے ہیں، اس لئے ان کو جدلی کہا جاتا ہے، اپنے اعمال کے ذریعہ مونادات چند مقاصد کے لئے سرگرداں ہیں اور ان مقاصد کو اقدار (VALUES) کا نام دیا جاتا ہے، اقدار کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے جس سے کہ ہم ایمان کے ذریعہ منسلک ہیں، چنانچہ یہ پروفیسر شریف کے افکار کا خلاصہ ہے۔

ہندوستان کے مسلمان فلاسفہ آج کل یا تو ایسے مختصر رسالے لکھنے میں مصروف ہیں جن میں اسلام کے کلاسیکی فلسفہ کی محض روایتی انداز میں تشریح کی جاتی ہے یا پھر وہ یورپی فلاسفہ کے افکار پر تنقید میں لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں، ایسے مقالے نہ ہونے کے برابر ہیں کہ جن میں مغربی فلسفیوں کے افکار کا مقابلہ اسلامی

---

[1] مودودی: اسلامی آئین و دستور پاکستان ہیرالڈ پریس کراچی ۱۹۵۵ء۔

مفکروں کے ساتھ کیا گیا ہو، ہندو اور بودھی فلاسفہ کے افکار کا تقابلی مطالعہ سرے ہی سے نہیں کیا جاتا۔ تخلیقی تصانیف کا فقدان ہے، ایسے مضامین بھی بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں کہ جن میں اسلامی فلسفہ کے مہتم بالشان مسائل کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہو، یہ صورتِ حال قریب قریب تمام اسلامی دنیا میں پائی جاتی ہے۔ محمد حسین الزیات لکھتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں اسلام کے چند بنیادی نظریئے بھی ایسے ہیں کہ جو ارتقا اور ردو بدل کی منزلوں سے گزرے ہوں، فلسفۂ مذہب کے اندر بھی نشو ونما کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔[۱] موجودہ صدی میں اسلام کے بنیادی نظریوں کا نہ تو انتقادی جائزہ لیا جاتا ہے اور نہ ہی اس ضمن میں مذاکرات منعقد کیے جاتے ہیں۔[۲]

ان گنے چنے اصحابِ علم میں جنھوں نے کہ اسلامی تصورات کی جدید نقطۂ نظر سے تشریح کی ہے۔ حیدر آباد کے ڈاکٹر سید عبداللطیف کا نام لیا جا سکتا ہے، ان کی کتاب "دی مائنڈ القرآن بلڈس"[۳] ایک قابلِ قدر تصنیف ہے جس میں انھوں نے ایک نہایت ہی سلجھا ہوا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے ۱۹۵۲ء میں اکیڈمی آف اسلامک اسٹڈیز کی بنیاد رکھی، اس ادارے کے ذریعے وہ ایسے خیالات و افکار کی اشاعت و ترویج میں کوشاں ہیں کہ جن کا ماخذ قرآن اور حدیث ہے اور جن کا جائزہ عقلی اصولوں پر لیا جانا چاہیئے، وہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ ایسی احادیث پر اعتماد نہ کیا جائے جو بے معنی تعبیروں سے مملو ہوتی ہیں، اس جہت میں کافی اچھا کام ہو رہا ہے۔

دہلی کی جامعہ ملیہ اسلامیہ نے بھی قابلِ قدر کام انجام دیئے ہیں، ڈاکٹر ذاکر حسین اس ادارے سے قریبی تعلق رکھتے ہیں، فلسفہ تعلیم پر گاندھی جی کے تصورات سے اثر قبول کرنے کے بعد انھوں نے بنیادی تعلیمی پروگرام مرتب کیا تھا، اس پروگرام کے بے ہنگم طریقے پر نافذ کی جانے والی پالیسی پر کچھ عرصہ قبل انھوں نے کڑی تنقید بھی کی تھی، ملک کی یک جہتی اور تعلیمی ترقی کے سلسلے میں علی گڈھ کے وائس چانسلر اور صوبہ بہار کے گورنر کی حیثیتوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں، وہ عوام الناس میں

---

[۱] اسلام دنیائے جدید میں، ایڈیٹر ڈی، ایس فرانک واشنگٹن ۱۹۵۱ء مزید دیکھئے فضل الرحمن اسی تصنیف میں

[۲] کینتھ کراگ: 'اسلام اور مغرب' ایڈیٹر آر ین فری، ۱۹۵۷ء [۳] The Mind of Quran Builds

اپنے بے انتہا خلوص، علمیت، بصیرت اور کشادہ دلی کے باعث حد درجہ مقبول ہیں، بلاشبہ وہ مشرق کے سب میں بڑے تعلیمی ماہر ہیں، بنیادی تعلیم کے تصورات کی اشاعت اور توضیح کے سلسلے میں پروفیسر کے جی سیدین کا اعتراف نہایت ضروری ہے، وزارت تعلیم کے سکریٹری کی حیثیت میں اور اپنی تصانیف کے ذریعہ سیدین نے آزاد ہندوستان کے تعلیمی مسائل کا خاطر خواہ حل ڈھونڈھ نکالا ہے، یہ کتنی عجیب بات ہے کہ آزاد ہندوستان میں تعلیمی ڈھانچے میں ردوبدل کرنے، تعلیم کی نئے سرے سے تنظیم کرنے اور اس کے اندر ترقی، حرکت وتجربے کی روح پھونکنے والے چار مسلمان اصحاب ہی ہیں، اور یہ چار ماہر آزاد، ذاکر حسین، کبیر اور سیدین ہیں۔ جدید ہندوستان میں مسلمانوں کے تعلیمی فلسفوں کی تشریح وتوضیح اور ان کا مناسب جائزہ لینے کے لئے ایک علیحدہ مضمون کی ضرورت ہے،

علی گڈھ اور عثمانیہ یونیورسٹی جیسے اداروں میں اسلامی فلسفہ کی تدریس کا انتظام ہے اور اس مضمون کی حد تک ریسرچ کی سہولتیں بھی مہیا کی جاتی ہیں، عثمانیہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر میر ولی الدین، تصوف کے زبردست ماہر ہیں، اتنا ہی نہیں بلکہ اگر کسی شخص نے متصوفانہ زہد کا مکمل نمونہ پیش کیا ہے تو وہ ڈاکٹر میر ولی الدین ہیں، ان کے بے شمار مضامین اور ان کی کتاب 'قرآن اور تصوف' اس موضوع پر ایک قابل قدر اضافہ ہیں، موصوف کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کرنے والے طلباء کی تعداد بھی خاصی ہے، ڈاکٹر ولی الدین حالیہ انڈین فلاسفیکل کانگریس کے صدر بھی منتخب ہوئے ہیں اور یہ ایک ایسا اعزاز ہے کہ جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں، علی گڈھ کے پروفیسر عمر الدین ایک قابل اسکالر اور محقق ہیں اور ان کے رفیق کار ظفر احمد صدیقی نے بھی کافی مضامین لکھے ہیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر سید وحید الدین ماربرگ (جرمنی) کے تحصیل یافتہ ہیں، موصوف ان بہترین عالموں میں سے ہیں کہ جن سے مجھے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، میرے خیال میں ہندوستان کے اندر بہت ہی کم اصحاب ایسے ملیں گے کہ جنھیں یورپی افکار کے اصل جرمنی اور انگریزی ماخذوں پر اتنا عبور حاصل ہوگا جتنا کہ ڈاکٹر وحید الدین کو ہے۔ وہ نہایت ہی شرمیلے اور سادہ طبیعت کے انسان ہیں، چوں کہ ڈاکٹر وحید الدین کا شمار زیادہ لکھنے والوں میں نہیں ہوتا، اس لئے وہ علمی حلقوں میں بہت کم

متعارف ہیں، فلسفۂ مذہب اور مابعد الطبیعات ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں، ڈاکٹر عابد حسین کی تصنیف "گاندھی جی اور نہرو کی راہیں" ان دو شخصیتوں کے فلسفوں کو بڑے موثر انداز میں پیش کرتی ہے، ڈاکٹر عابد حسین جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڈھ سے بھی منسلک رہے ہیں۔

پروفیسر ہمایوں کبیر (پیدائش ۱۹۰۶ء) کے ذکر کو میں نے آخر کے لئے اٹھا رکھا ہے، ہمایوں کبیر ایک اور بجنل مفکر ہیں، ویسے اپنے نظریوں کو وہ مبادیات کی صورت میں پیش کرتے آئے ہیں غالباً انہیں اتنا وقت نہ مل سکا کہ ان نظریوں کو وہ منضبط طریقے پر پیش کر سکتے، پروفیسر کبیر کی تصنیفی زندگی کا آغاز کانٹ کے ترجمے سے ہوا تھا، اپنی تصنیف "ہندوستانی میراث" میں انھوں نے ہندی کلچر کا بہترین تاریخی جائزہ لیا ہے۔ اس کے بعد پروفیسر کبیر نے مزید تین کتابیں شائع کیں جو اُن کے خطبات اور مضامین کا انتخاب پیش کرتی ہیں، "سائنس جمہوریت اور اسلام" پروفیسر کبیر کی ایک قابلِ قدر تصنیف ہے۔ وہ یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کے بنیادی تصورات سائنس اور جمہوریت کے تصورات سے ہم آہنگ ہیں، اور ان کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔

چوں کہ کبیر بہ نفسِ نفیس ہندوستان جدید اور دیگر عالمی مسائل سے دوچار ہیں اس لئے ان کے نزدیک سب میں زیادہ اہم فلسفیانہ مسئلہ یہ ہے کہ اس جمود و انتشار سے کیوں کر باہر نکلا جا سکتا ہے جس کے اندر دنیا آج اپنے آپ کو مبتلا پاتی ہے، سوسائٹیوں اور افراد کی ماہیت کو سمجھے بغیر اس مقصد کا حصول ممکن نہیں، موجودہ انتشار کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اصل میں افراد اور جماعتوں کے درمیان پایا جاتا ہے[۱]۔ دوسرے لفظوں میں یہ اقتدار اور آزادی کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرنے کی سعیِ ناکام کا نتیجہ ہے انسان ایک سماجی وجود ہے اس لئے کہ وہ ذی عقل (RATIONAL) ہے، ذی عقل کہلانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ انفرادی نقطۂ نظر سے بالاتر ہو جائے، انتشار کی اقتصادی اور سیاسی توجیہات کو محض سادہ تفہیمیں کہنا چاہئے جو انسانی عقابیت کو مبالغہ آمیز انداز میں پیش کرتی ہیں اور جن کا مفروضہ یہ ہے کہ

۱؎ ہندی فلسفہ کے ہمعصر مذاہب (۱۹۵۲ء) صفحہ ۳۵۷ — ۳۵۸

یہ مضمون پروفیسر کبیر کی کتاب "سائنس ڈیموکریسی اور اسلام" میں بھی شامل ہے (ص ۶۰ - ۸۰)

انسان منظم طریقہ پر کام کرنے کا عادی ہے، حالانکہ یہ اصل واقعہ نہیں کیوں کہ انسان اپنے اندر غیر عقلی عناصر بھی رکھتا ہے، واضح رہے کہ اس طرح کی تشریح کے ذریعہ ہم کو انسانی عمل کے کسی مخصوص جبلّی نظریہ تک نہیں پہنچنا چاہئے کیوں کہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ دوسری توضیحات کے ناکام ہونے پر ایک مخصوص انسانی فصل کی توجیہ کے لئے ہم کسی خاص جبلّت کو تسلیم کر رہے ہیں۔[۱]

پروفیسر کبیر کا خیال ہے کہ آزادی اور اقتدار کے باہمی تصادم کے نتیجے کے طور پر سماجی مظاہر، بے استقلالی کی کیفیت سے دوچار ہوتے رہتے ہیں اور اس بے استقلالی کو بڑھاوا محض سماجی نظام اور سماجی مواد (CONTEUL) کے درمیان عدم مطابقت کی وجہ سے ملتا رہتا ہے، تمام سماجی تبدیلیوں کا بھی یہی باعث ہے، ایک روشن خیال پالیسی کا مقصد ایسے حالات پیدا کرنا ہے کہ جس کے تحت سماجی حیات کے تسلسل کو پرتشدد مظاہروں کی ضرورت محسوس کئے بغیر تبدیلیاں لائی جاسکیں۔[۲]

انسان کو سماجی وجود تسلیم کرنے کے باوجود پروفیسر کبیر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ انسان 'ابدیت کے راستہ کا تنہا مسافر' بھی ہے۔[۳] فرد کی حیثیت ایک UNIQUE UNIVERSAL کی ہے اور اس کی UNIQUENESS کی تشکیل تخیل کے نفوذ کی وجہ سے ہوتی ہے، جب تک کہ ہم تخیل، فنی شعور اور اخلاق کا تنقیدی نقطۂ نظر سے جائزہ نہیں لیتے، اس وقت تک فرد کو سمجھنا محال ہے، اس طرح کے علم کے بغیر سوسائٹیوں کی نیچر اور موجودہ مسائل کو سمجھنے میں ہمیں کامیابی نہیں ہوسکتی۔[۴] اسی قوتِ متخیلہ کے ذریعہ ایک مکمل سماج کی تعمیر کرنا، متوازن طریقے پر اس کے امکانات کا جائزہ لینا، موجودہ سماجی انواع کی تنقید کرنا (تاکہ ان کے ذریعہ عمل کا ایک ایسا پروگرام مرتب کیا جاسکے جو تبدیلیوں کی روشنی میں تدریجی طور پر سماج کی تشکیل کر سکے) آج کے فلسفہ کا لائحۂ عمل ہونا چاہیے۔[۵] اگلے تین مضامین میں پروفیسر کبیر نے ولفیر اسٹیٹ (WELFIRE STATE) انسانی حقوق اور جمہوریت کے مفہوم کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱؎ ہندی فلسفہ کے ہمعصر مذاہب (۱۹۵۲) (ص ۳۶۱) ۲؎ ایضاً ص ۳۶۷۔
۳؎ ایضاً ص ۳۶۳ ۴؎ ایضاً ص ۳۷۱ ۵؎ ایضاً ص ۳۷۵۔

اوپر کے مباحث سے یہ صاف روشن ہے کہ پروفیسر ہمایوں کبیر سماجی فلسفہ کا ایک منضبط خاکہ پیش کرنا چاہتے ہیں، ان تصورات کو اگر مزید نشو ونما کا موقع ملے تو بلا شبہ یہ جدید ہندوستان کا ایک عظیم سماجی فلسفہ ہوگا۔ پروفیسر کبیر کے خیالات کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی فکر پر افلاطون، کانٹ اور وائٹ ہیڈ کا بہت زیادہ اثر ہے، ان کے تعلیمی فلسفہ پر وائٹ ہیڈ کا اثر بہت زیادہ نمایاں ہے۔

سماجی اور سیاسی افکار کے میدان میں اے، ایس، ایوب نے قابلِ قدر اضافے کئے ہیں۔ ان کی 'مارکسی انتقادیت' ذہنوں کو اکسانے والی چیز ہے۔

عرب مسلمان پہلی صدی ہجری میں ہندوستان میں ساحل ملیبار تک پہنچ چکے تھے، تجارتی روابط کو انھوں نے اس قدر توسیع دی کہ ساتویں صدی عیسوی کے آخر تک جنوبی ہند میں وہ اپنی نوآبادیاں قائم کر چکے تھے، ۷۱۲ء میں وہ فاتحوں کی حیثیت میں سندھ میں داخل ہوئے، افغان، ترک اور مغل مسلمانوں نے ہندوستان میں غیر معمولی فتوحات حاصل کیں اور یہاں پر وہ حاکموں کی حیثیت میں آباد ہوئے جس طرح کہ ویدک آریائی، پارتھین، سی تھین اور ہن ابتدائی زمانوں میں یہاں آکر آباد ہوئے تھے، مسلمانوں کو ہندوستان میں رہتے ہوئے تیرہ سو برس کا عرصہ ہوتا ہے، محض چند افراد کے سوا دورِ متوسط اور آج کل کے مسلمان یہی سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظام اپنی مکمل حالت کو پہنچ چکا ہے۔ یہ کہ بہت عرصہ قبل تمام مسائل کا حل دریافت کیا جا چکا ہے۔ قرآن میں ہر سوال کا جواب موجود ہے، یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت اپنے پڑوسیوں کے کلچر کے ساتھ سرد مہری برتتی ہے اور ان کے عظیم مفکروں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتی، ہمارے ہندوستانی مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ہندو فلسفہ کے تعلق سے البیرونی، ابوالفضل اور فیضی کی طرح اور یونانی فلسفہ کے تعلق سے عظیم عرب فلسفیوں کی طرح اپنے پڑوسیوں کے کلاسیکی اور جدید فکری سرمایہ اور یورپی فلسفہ کی طرف توجہ دیں'[1]

---

[1] یہاں پر اس امر کا اظہار نہایت ضروری ہے کہ ہمارے ہندو حضرات بھی اسلامی افکار سے سرد مہری برتتے ہیں، اور کبھی اسلامی مفکروں کے خیالات سے متمتع ہونے کی کوشش نہیں کرتے، ایسے ہندو مفکر بہت ہی کم ملیں گے جنھوں نے اسلامی فلسفہ کا مطالعہ اس کے ذیلی ماخذوں کی حد تک ہی کیا ہوگا (باقی ص۴۸ پر)

ہند جدید کے مسائل اور عالمی مسائل سے اغماض نہ برتیں، ان کو چاہئے کہ عظیم اسلامی میراث اور اس کی روایات کے حامل ہوتے ہوئے بھی اپنے افکار کا نئے سرے سے جائزہ لینے کے لئے تیار رہیں، ہندوستانی جمہوری دستور نے قدامت پسند طاقتوں اور نام نہاد علماء کی لادی گئی پالیسیوں اور خیالات کی عدم موجودگی نے، جدید دنیا کی دیگر مسلم جماعتوں کے مقابلے میں ہندوستانی مسلمانوں کو غیر معمولی اہمیت کا حامل بنادیا ہے، ان کا ایقان زیادہ طاقتور، زیادہ صحیح اور ترقی پسند اصولوں پر مبنی ہے، اور یہ خصوصیت دوسری جگہوں کے مسلمانوں میں شاید ہی پائی جاتی ہوگی [۱] پروفیسر اسمتھ کہتے ہیں کہ دنیائے اسلام میں بشمول ترکی کے کہیں پر بھی ایک مسلمان کو اتنی آزادی نصیب نہیں ہے جتنی کہ ہندوستان میں، یہاں پر وہ ایمان داری اور خلوص کے ساتھ مذہبی مسائل پر اپنے ذہن کو مرکوز کرسکتا ہے، نڈر ہو کر گفتگو کرسکتا ہے، اس کو اپنے افکار کی اشاعت و ترویج کی آزادی بھی میسر ہے [۲] چناں چہ اس آزادی اور ان مواقع کے نتائج کا دنیا کو انتظار ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷) ہندو اور مسلم مفکروں کا ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال، ان کے فلسفوں کو سمجھنے کی باہمی کوشش فلسفیانہ فکر کے لئے ایک نیا ماحول پیدا کرسکتی ہے، اس سے ایک بڑا مقصد یہ حاصل ہوگا کہ ہم اپنی غیر مذہبی جمہوری روایات کو مضبوط کرسکیں گے اور ایک آزاد خیال نقطۂ نظر کے لئے مناسب فضا ہموار ہو جائے گی۔ یہ کتنی شرم کی بات ہے کہ ہندوؤں کے درمیان البیرونی، ابوالفضل اور داراشکوہ جیسی ایک بھی مثال نہیں ملتی، بڑا مبارک ہوگا وہ دن جبکہ ہمارے ہندو حضرات عربی اور فارسی زبانوں کی تحصیل کریں گے۔ ابن سینا اور الغزالی کو ان کے اصلی ماخذوں کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ [۱] اسمتھ ایضاً ص ۳۵۸ [۲] اسی تصنیف میں ص ۲۸۹

رہنمائے قرآن

اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی صداقت کو سمجھنے کے لئے اپنے انداز کی یہ بالکل جدید کتاب ہے، جو خاص طور پر غیر مسلم یورپین اور انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کے لئے لکھی گئی ہے، جدید ایڈیشن، قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ :- مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶